یہ تصور کیسے کیا جائے کہ زمانِ موت جس کا اس وقت وجود ہی نہیں اس کو جان لے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہاں ایک چیز کی نفی سے خود بخود دوسری چیزوں کی نفی بدرجۂ اولیٰ معلوم ہوجاتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کو منفی عنوان سے بیان فرمایا۔ اور پہلی تین چیزیں تو انسانی دسترس سے ظاہر حالات میں خود ہی خارج ہیں، ان میں انسان کے علم کا دخل نہ ہونا واضح ہے۔ اس لئے ان میں مثبت عنوان اختیار کر کے ان کا اختصاص حق تعالیٰ کے ساتھ بیان کردیا گیا۔

اور ان میں سے پہلے جملے کو جملۂ اسمیہ سے اور بعد کے دونوں جملوں کو فعلیہ کے عنوان سے ذکر کرنے میں شاید یہ حکمت ہے کہ قیامت تو ایک امر متعین ہے اس میں تجدد نہیں بخلاف نزولِ مطر اور حمل کے کہ ان کے حالات میں تجدد ہوتا رہتا ہے، اور جملۂ فعلیہ تجدد پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے ان دونوں میں وہ استعمال کیا گیا، اور ان دونوں میں بھی حمل کے حالات میں تو علم الٰہی کا ذکر فرمایا وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ، اور نزولِ بارش میں علم کا ذکر ہی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں بارش نازل کرنے کا ذکر کر کے ضمناً یہ بھی بتلا دیا کہ بارش جس سے انسان کے ہزاروں منافع وابستہ ہیں وہ اللہ ہی کے کرنے سے آتی ہے، اور کسی کے تصرف میں نہیں، اور اس کا علمی اختصاص تو سیاقِ کلام ہی سے ثابت ہوجاتا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

تمّت

سورۃ لقمٰن بحمد اللہ سبحانہ
فی ۵ ذی الحجۃ ۱۳۹۱ھ یوم الاثنین

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ

	سُوْرَةُ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَّثَلٰثُ رُكُوْعَاتٍ	
	سورۃ سجدہ مکہ میں نازل ہوئی اس کی تیس آیتیں ہیں اور تین رکوع۔	
	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	
	شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔	

الٓمّٓ ۝۱ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲

اتارنا کتاب کا اس میں کچھ دھوکا نہیں پروردگارِ عالم کی طرف سے ہے

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا

کیا کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ باندھ لایا ہے کوئی نہیں وہ ٹھیک ہے تیرے رب کی طرف سے تاکہ تو ڈر سنائے ان لوگوں

مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝۳

کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈرانے والا تجھ سے پہلے تاکہ وہ راہ پر آئیں۔

خلاصۂ تفسیر

الٓمّٓ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے، (اور) اس میں کچھ شبہ نہیں (اور) یہ رب العالمین کی طرف سے ہے (جیسا کہ اس کتاب کا اعجاز خود اس کی دلیل ہے) کیا یہ (منکر) لوگ یوں کہتے ہیں کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ اپنے دل سے بنا لیا ہے (یعنی یہ کہنا محض لغو اور جھوٹ ہے یہ بنایا ہوا نہیں) بلکہ یہ سچی کتاب ہے آپ کے رب کی طرف سے (آئی ہے) تاکہ آپ (اس کے ذریعہ سے) ایسے لوگوں کو (عذابِ الٰہی سے) ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تاکہ وہ لوگ راہ پر آجائیں۔

معارف و مسائل

مَآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ، نذیر سے مراد اس جگہ رسول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قریش مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا تھا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انبیاء کی دعوت بھی ان کو اب تک نہ پہونچی تھی، کیونکہ دوسری آیت قرآن میں واضح طور پر ارشاد ہے وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ، یعنی کوئی امت اور جماعت دنیا میں ایسی نہیں جس میں کوئی اللہ سے ڈرانے والا اور اس کی طرف دعوت دینے والا نہ آیا ہو۔

اس آیت میں لفظ نذیر اپنے عام لغوی معنی میں ہے۔ یعنی اللہ کی طرف دعوت دینے والا وہ خواہ رسول اور پیغمبر ہو یا ان کا کوئی نائب، خلیفہ، یا عالمِ دین۔ تو اس آیت سے تمام امتوں اور جماعتوں تک توحید کی دعوت پہونچ جانا معلوم ہوتا ہے، وہ اپنی جگہ صحیح و درست اور حق تعالیٰ کی رحمتِ عامہ کا مقتضا ہے، جیسا کہ ابوحیان نے فرمایا کہ توحید اور ایمان کی دعوت کسی زمانے اور کسی مکان اور کسی قوم میں کبھی منقطع نہیں ہوئی، اور جب کہیں نبوت پر زمانہ دراز تک گذر جانے کے بعد اس نبوت کا علم رکھنے والے علماء بہت کم رہ گئے تو کوئی دوسرا نبی و رسول مبعوث ہو گیا۔ اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اقوامِ عرب میں بھی بقدر ضرورت توحید کی دعوت پہلے سے ضرور پہونچی ہوگی، مگر اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ یہ دعوت خود کوئی نبی و رسول لے کر آیا ہو، ہو سکتا ہے کہ ان کے نائبین علماء کے ذریعہ پہونچ گئی ہو۔ اس لئے اس سورۃ اور سورۂ یٰسٓ وغیرہ کی وہ آیتیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قریشِ عرب میں آپ سے پہلے کوئی نذیر نہیں آیا تھا، ضروری ہے کہ اس میں نذیر سے مرادِ اصطلاحی معنی کے اعتبار سے رسول و نبی ہو۔ اور مراد یہ ہو کہ اس قوم کے اندر آپ سے پہلے کوئی نبی و رسول نہیں آیا تھا اگرچہ دعوتِ ایمان و توحید دوسرے ذرائع سے یہاں بھی پہونچ چکی ہو۔

زمانۂ فترت یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بہت سے حضرات کے متعلق یہ ثابت ہوا ہے کہ وہ دینِ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام پر قائم تھے، توحید پر ان کا ایمان تھا، بت پرستی اور بتوں کے لئے قربانی دینے سے متنفر تھے۔

روح المعانی میں موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ زید بن عمرو بن نفیل جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نبوت سے پہلے آپ سے ملے بھی تھے، مگر نبوت سے پہلے ان کا انتقال اس سال میں ہو گیا جس میں قریش نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی اور یہ واقعہ آپ کی نبوت سے پانچ سال پہلے کا ہے، ان کا حال موسیٰ بن عقبہ نے یہ نقل کیا ہے

کہ قریش کو بت پرستی سے روکتے تھے، اور بتوں کے نام پر قربانی دینے کو بہت برا کہتے تھے، اور مشرکین کے ذبائح کا گوشت نہ کھاتے تھے۔

اور ابوداؤد طیالسی نے زید بن عمرو بن نفیل کے صاحبزادے حضرت سعید بن زید بن عمرو جو صحابہ میں عشرۂ مبشرہ میں داخل ہیں یہ روایت کیا ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے والد کا جو کچھ حال تھا وہ آپ کو معلوم ہے کہ توحید پر قائم، بت پرستی کے منکر تھے، تو کیا میں ان کے لئے دعائے مغفرت کر سکتا ہوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں ان کے لئے دعاءِ مغفرت جائز ہے، وہ قیامت کے روز ایک مستقل امت ہو کر اٹھیں گے۔ (روح)

اسی طرح ورقہ بن نوفل جو آپ کے زمانۂ نبوت شروع ہونے اور نزولِ قرآن کی ابتداء کے وقت موجود تھے توحید پر قائم تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنے کا اپنا عزم ظاہر کیا تھا، مگر فوراً بعد ہی ان کی وفات ہو گئی۔ یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ اقوامِ عرب بھی دعوتِ انبیاء اور دعوتِ ایمان و توحید سے محروم تو نہیں تھیں، مگر خود ان کے اندر کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ واللہ اعلم

ان تینوں آیتوں میں قرآن کی حقانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے کا اثبات ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ

اللہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے چھ دن کے

اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ

اندر پھر قائم ہوا عرش پر، کوئی نہیں تمہارا اس کے سوائے حمایتی

وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاۗءِ اِلَى

اور نہ سفارشی پھر کیا تم دھیان نہیں کرتے۔ تدبیر سے اتارتا ہے کام آسمان سے زمین

الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ

تک پھر چڑھتا ہے وہ کام اس کی طرف ایک دن میں جس کا پیمانہ ہزار برس کا ہے

مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۵ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ

تمہاری گنتی میں۔ یہ ہے جاننے والا چھپے اور کھلے کا زبردست

الرَّحِيْمُ ﴿٦﴾ الَّذِىْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَىْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ

رحم والا ۔ جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور شروع کی انسان کی پیدائش

مِنْ طِيْنٍ ﴿٧﴾ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿٨﴾

ایک گارے سے ۔ پھر بنائی اس کی اولاد نچڑے ہوئے بے قدر پانی سے ۔

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ

پھر اس کو برابر کیا اور پھونکی اس میں اپنی ایک جان اور بنا دیئے تمہارے لئے کان اور

الْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿٩﴾

آنکھیں اور دل تم بہت تھوڑا شکر کرتے ہو

خلاصۂ تفسیر

اللہ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو اور اس مخلوق کو جو ان دونوں کے درمیان میں موجود ہے چھ روز (کی مقدار) میں پیدا کیا پھر عرش پر (جو مشابہ ہے تخت سلطنت کے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اس کی شان کے لائق ہے وہ ایسا عظیم ہے کہ) بدون اس (کی رضا و اذن) کے نہ تمہارا کوئی مددگار ہے اور نہ سفارش کرنے والا (البتہ اذن سے شفاعت ہو جائے گی اور نصرت کے ساتھ اذن ہی متعلق نہ ہوگا) سو کیا تم سمجھتے نہیں ہو (کہ ایسی ذات کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا اور) وہ (ایسا ہے کہ) آسمان سے لیکر زمین تک (جتنے امور ہیں) ہر امر کی (وہی) تدبیر (اور انتظام) کرتا ہے، پھر ہر امر اسی کے حضور میں پہونچ جائے گا ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہاری شمار کے موافق ایک ہزار برس کی ہوگی (یعنی قیامت میں سب امور اور ان کے متعلقات اس کے حضور میں پیش ہوں گے کقولہ تعالیٰ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ) وہی ہے جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا زبردست رحمت والا جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی (یعنی جس مصلحت کے لئے اس کو بنایا اس کے مناسب بنایا) اور انسان (یعنی آدم علیہ السلام) کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اس (انسان یعنی آدم) کی نسل کو خلاصہ اخلاط یعنی ایک بے قدر پانی سے (یعنی نطفہ سے جو فضلہ ہے ہضم رابع غذا کا جس میں چار خلط خون، بلغم، سوداء، صفرا بنتے ہیں) بنایا پھر (ماں کے رحم میں) اس کے اعضاء درست کئے اور اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونکی

اور (بعد تولد) تم کو کان اور آنکھیں اور دل (یعنی ادراکات ظاہرہ و باطنہ) دیئے (اور ان سب باتوں کا جو کہ دال علی القدرۃ والانعام ہیں مقتضا یہ تھا کہ خدا کا شکر کرتے جس کی فرد اعظم توحید ہے مگر) تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو (یعنی نہیں کرتے)۔

معارف و مسائل

روز قیامت کا طول فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ، یعنی اس دن کی مقدار تمہاری گنتی کے اعتبار سے ایک ہزار سال کی ہوگی، اور سورۂ معارج کی آیت میں ہے فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ، یعنی اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہوگی۔

اس کا ایک سیدھا سا جواب تو وہ ہے جو بیان القرآن میں اختیار کیا گیا ہے کہ اس دن کے ہولناک ہونے کے سبب یہ ان لوگوں کو بہت دراز محسوس ہوگا۔ اور یہ درازی بمقدار اپنے ایمان و اعمال کے ہوگی۔ جو بڑے مجرم ہیں ان کو زیادہ جو کم ہیں ان کو کم محسوس ہوگی، یہاں تک کہ جو دن بعض کو ایک ہزار سال کا معلوم ہوگا وہ دوسروں کے نزدیک پچاس ہزار سال کا ہوگا۔

تفسیر روح المعانی میں اور بھی متعدد توجیہات علماء اور صوفیاء کرام سے نقل کی گئی ہیں، مگر وہ سب کے سب قیاسات ہی ہیں۔ ایسی چیز جس کو قرآن کا مدلول کہا جا سکے یا جس پر یقین کیا جا سکے کوئی نہیں۔ اس لئے اَسلم وہی طریقہ ہے جو سلف صالحین صحابہ و تابعین نے اختیار کیا کہ اس ایک پچاس کے فرق کو علم الٰہی کے حوالہ کیا اور خود اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ ہمیں معلوم نہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس کے متعلق فرمایا هُمَا يَوْمَانِ ذَكَرَهُمَا اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ كِتَابِهٖ اَللّٰهُ تَعَالٰى اَعْلَمُ بِهِمَا فَاَكْرَهُ اَنْ اَقُوْلَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ مَا لَا اَعْلَمُ (اخرجه عبد الرزاق والحاكم وصححه) "یعنی یہ دو دن ہیں جن کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور اللہ ہی ان کی حقیقت کو جانتا ہے، اور میں اس کو برا سمجھتا ہوں کہ قرآن میں وہ بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں۔"

دنیا کی ہر چیز اپنی ذات میں حسن اور اچھی ہے برائی اس کے غلط استعمال سے آتی ہے اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ، یعنی اللہ وہ ذات ہے جس نے ہر چیز کی خلقت کو حسین اور بہتر بنایا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس عالم میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا فرمایا وہ حکمت اور مصالح عالم کے اقتضاء سے بنایا ہے۔ اس لئے ہر چیز اپنی ذات کے اعتبار سے ایک حسن رکھتی ہے۔

اور ان سب سے زیادہ حسین اور بہتر انسان کو بنایا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا، لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ "یعنی ہم نے انسان کو سب سے زیادہ حسین تقویم اور بہتر شکل و صورت میں پیدا کیا ہے"۔

اور دوسری مخلوقات خواہ وہ ظاہر میں کتنی ہی قبیح اور بُری سمجھی جاتی ہوں، کُتا، خنزیر، سانپ، بچھو، شیر اور بھیڑیا یہ سب زہریلے اور درندے جانور عام نظروں میں بُرے سمجھے جاتے ہیں، مگر مجموعۂ عالم کے مصالح کے اعتبار سے ان میں سے کوئی بُرا نہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں ۔ کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ کُلَّ شَیْءٍ میں تمام جواہر اور اعراض داخل ہیں یعنی وہ چیزیں بھی جو وجود جوہری رکھتی ہیں جیسے حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ اور اعراض بھی جن میں اخلاق و اعمال بھی داخل ہیں۔ یہاں تک کہ جو اخلاق بُرے بتلائے جاتے ہیں جیسے غصہ، حرص، شہوت وغیرہ یہ بھی اپنی ذات میں بُرے نہیں، ان کی بُرائی غیر مصرف میں صرف کرنے اور بے محل استعمال کرنے سے ہوتی ہے۔ اپنے محل میں رہیں تو ان میں کوئی چیز بُری نہیں۔ لیکن مراد اس سے ان اشیاء کی جہت تخلیق و تکوین ہے، کہ وہ خیر ہی خیر اور حسن ہی حسن ہے۔ اور اعمال کی دوسری جہت انسان کا کسب و اکتساب ہے، یعنی اپنے اختیار کو کسی کام کے کرنے میں صرف کرنا۔ تو اس حیثیت سے سب حسن نہیں، بلکہ ان میں تفصیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کی اجازت نہیں دی وہ حسن نہیں، قبیح ہیں۔ واللہ اعلم

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ، اس سے پہلے یہ بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم کی ہر چیز کو حسن بنایا ہے، اس کے بعد انسان کا ذکر فرمایا جو ان سب میں زیادہ حسین ہے۔ اس کے ساتھ کمالِ قدرت کے اظہار کے لئے یہ بھی بتلا دیا کہ جس انسان کو ہم نے سب مخلوق سے زیادہ بہتر بنایا ہے وہ یہ نہیں کہ اس کا مادۂ تخلیق کچھ سب سے زیادہ اشرف و اعلیٰ اور بہتر لیا گیا، اس لئے سب سے بہتر ہو گیا۔ بلکہ مادۂ تخلیق تو اس کا سب سے کمتر چیز یعنی مٹی کو بنایا گیا، پھر قدرت کاملہ اور حکمتِ بالغہ نے اس کمترین چیز کو کہاں سے کہاں پہونچایا کہ اشرف المخلوقات قرار دیا گیا۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۭ بَلْ

اور کہتے ہیں کہ جب ہم رَل گئے زمین میں کیا ہم کو نیا بننا ہے ؟ کچھ نہیں

هُمْ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۰﴾ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ

وہ اپنے رب کی ملاقات سے منکر ہیں۔ تو کہہ قبض کر لیتا ہے تم کو فرشتہ موت کا جو

وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ

تم پر مقرر ہے پھر اپنے رب کی طرف پھر جاؤ گے۔ اور کبھی تو دیکھے جس وقت کہ منکر

نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ

سر ڈالے ہوئے ہوں گے اپنے رب کے سامنے اور رب ہمارے ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا اب ہم کو بھیج دے کہ ہم

صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا

کریں بھلے کام ہم کو یقین آ گیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو سُجھا دیتے ہر جی کو اس کی راہ

وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ

لیکن ٹھیک پڑ چکی میری کہی بات کہ مجھ کو بھرنی ہے دوزخ جنوں سے اور آدمیوں سے

اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا

اکٹھے۔ سو اب چکھو مزہ جیسے تم نے بھلا دیا تھا اس اپنے دن کے ملنے کو ہم نے بھی

نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

بھلا دیا تم کو اور چکھو عذاب سدا کا عوض اپنے کئے کا۔

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا

ہماری باتوں کو وہی مانتے ہیں کہ جب ان کو سمجھائے ان سے گر پڑیں سجدہ کر کر،

وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۱۵﴾ تَتَجَافٰى

اور پاک ذات کو یاد کریں اپنے رب کی خوبیوں کے ساتھ اور وہ بڑائی نہیں کرتے۔ جدا رہتی ہیں

جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ وَّ

ان کی کروٹیں اپنے سونے کی جگہ سے پکارتے ہیں اپنے رب کو ڈر سے اور لالچ سے اور ہمارا

مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ

دیا ہوا کچھ خرچ کرتے ہیں۔ سو کسی جی کو معلوم نہیں جو چھپا دھری ہے ان کے واسطے

مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَاۤءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۷﴾ اَفَمَنْ كَانَ

آنکھوں کی ٹھنڈک، بدلہ اس کا جو کرتے تھے ۔ بھلا ایک جو ہے

مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۭ لَا يَسْتَوٗنَ ﴿۱۸﴾ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

ایمان پر کیا برابر ہو اس کے جو نافرمان ہو؟ نہیں برابر ہوتے، سو وہ لوگ جو یقین لائے اور کئے

الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۡ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

کام بھلے تو ان کے لئے باغ ہیں رہنے کے، مہمانی ان کاموں کی وجہ سے جو کرتے تھے

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ

اور وہ لوگ جو نافرمان ہوئے سو ان کا گھر ہے آگ، جب چاہیں کہ نکل پڑیں اس

يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ

میں سے الٹا دیئے جائیں پھر اسی میں اور کہیں ان کو چکھو آگ کا عذاب

الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ

جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے ۔ اور البتہ چکھائیں گے ہم ان کو تھوڑا

الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۱﴾

عذاب ورے اس بڑے عذاب کے تاکہ وہ پھر آئیں ۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ۭ اِنَّا

اور کون بے انصاف زیادہ اس سے جس کو سمجھایا گیا اس کے رب کی باتوں سے پھر ان سے منہ موڑ گیا ہم کو

مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ ع ۱۱ ۱۵

ہم کو ان گنہگاروں سے بدلہ لینا ہے

خلاصۂ تفسیر

اور یہ (کافر) لوگ کہتے ہیں کہ ہم جب زمین میں (مل جل کر) نیست و نابود ہو گئے، تو کیا ہم پھر (قیامت میں) نئے جنم میں آویں گے (اور یہ لوگ اس بعث و نشر پر صرف تعجب ہی نہیں ہیں جیسا کہ ظاہر ان کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے، بلکہ (درحقیقت) وہ لوگ اپنے

۵

رب سے ملنے کے منکر ہی ہیں (اور یہ استفہام ان کا انکاری ہے) آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ تمہاری جان موت کا فرشتہ قبض کرتا ہے جو تم پر (اللہ کی طرف سے) متعین ہے، پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹا کر لائے جاؤ گے (جواب میں اصل مقصود تو یہی ثُمَّ تُرْجَعُوْنَ ہے، اور يَتَوَفّٰىكُمْ کو بیچ میں بڑھا دینا تخویف کے لئے ہے کہ موت بھی فرشتہ کے ذریعہ سے آوے گی جو جان نکلنے کے وقت تم کو مارے دھاڑے گا بھی جیسا دوسری آیت میں ہے وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰۗىِٕكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ الخ پس مرنے کا انجام صرف خاک ہی میں مل جانا نہ ہوگا، جیسا تمہارا قول ءَاِذَا ضَلَلْنَا الخ سے معلوم ہوتا ہے) اور (اس رجوع کے وقت جس پر تُرْجَعُوْنَ دال ہے) اگر آپ (ان لوگوں کا حال) دیکھیں تو عجب حال دیکھیں جبکہ یہ مجرم لوگ (نہایت شرمندگی سے) اپنے رب کے سامنے سر جھکائے (کھڑے) ہوں گے (اور کہتے ہوں گے) کہ اے ہمارے پروردگار بس (اب) ہماری آنکھیں اور کان کھل گئے (اور معلوم ہو گیا کہ پیغمبروں نے جو کچھ کہا سب حق تھا) سو ہم کو (دنیا میں) پھر بھیج دیجئے ہم (اب کے جاکر خوب) نیک کام کیا کریں گے (اب) ہم کو پورا یقین آ گیا اور (یہ کہنا ان کا بے کار محض ہوگا اس لئے کہ) اگر ہم کو (یہ) منظور ہوتا (کہ ضرور ہی یہ راہ پر آئیں) تو ہم ہر اس شخص کو اس (کی نجات) کا راستہ (مقصود تک پہنچا دینے کے درجہ میں ضرور) عطا فرماتے (جیسا کہ ہدایت بمعنی مطلوب کا راستہ دکھانا ان کو عطا فرمائی ہے) ولیکن میری (تو) یہ (ازلی تقدیری) بات (بہت سی حکمتوں سے) محقق ہو چکی ہے کہ میں جہنم کو جنات و انسان دونوں (میں جو کافر ہوں گے ان) سے ضرور بھر دوں گا (اور بیان بعض حکمتوں کا سورۂ ہود کے اخیر میں ایسی ہی آیت کی تفسیر میں گزر چکا ہے) تو (ان سے کہا جائے گا کہ) اب اس کا مزہ چکھو کہ تم اپنے اس دن کے آنے کو بھولے رہے، ہم نے تم کو بھلا دیا (یعنی رحمت سے محروم کر دیا جس کو بھلانا مجازاً کہہ دیا) اور (ہم جو کہتے ہیں کہ مزہ چکھو تو ایک دو روز کا نہیں بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ) اپنے اعمال (بد) کی بدولت ابدی عذاب کا مزہ چکھو (یہ تو کفار کا حال اور ان کا مآل ہوا۔ آگے مومنین کا حال اور مآل مذکور ہے، یعنی) بس ہماری آیتوں پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو وہ آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں (جس کی تحقیق سورۂ مریم کے رکوع چہارم میں ہوئی ہے) اور اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرنے لگتے ہیں اور وہ لوگ (ایمان سے) تکبر نہیں کرتے (جیسا کافر کا حال آیا ہے وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا، یہ تو ان کی تصدیق و اقرار و اخلاق کا حال تھا اور اعمال کا حال یہ ہے کہ شب کو) ان کے پہلو خوابگاہوں سے

علٰحدہ ہوتے ہیں (خواہ فرض عشاء کے لئے یا تہجد کے لئے بھی اور اس سے سب روایتیں جمع ہوگئیں اور خالی علٰحدہ ہی نہیں ہوتے بلکہ) اس طور پر (علٰحدہ ہوتے ہیں) کہ وہ لوگ اپنے رب کو (ثواب کی) امید سے اور (عذاب کے) خوف سے پکارتے ہیں (اس میں نماز اور دعاء، ذکر سب آگیا) اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہیں (مطلب یہ کہ ایمان لانے والوں کی یہ صفات ہیں جن میں بعض تو نفس ایمان کا موقوف علیہ ہیں اور بعض کمالِ ایمان کا) سو کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لئے خزانہ غیب میں موجود ہے، یہ ان کو ان کے اعمال (نیک) کا صلہ ملا ہے (اور جب فریقین کا حال اور مآل معلوم ہوگیا) تو (اب بتلاؤ) جو شخص مؤمن ہو کیا وہ اس شخص جیسا ہو جائے گا جو بے حکم (یعنی کافر) ہو (نہیں) وہ آپس میں (نہ حالاً نہ مآلاً) برابر نہیں ہوسکتے (چنانچہ معلوم بھی ہوا ہے، اور خاص مآل میں برابر نہ ہونے کی تفصیل تاکید کے لئے پھر بھی سُن لو کہ) جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے، سو ان کے لئے ہمیشہ کا ٹھکانہ جنتیں ہیں، جو ان کے اعمال (نیک) کے بدلہ میں بطور ان کی مہمانی کے ہیں (یعنی مثل مہمان کے ان کو یہ چیزیں اکرام کے ساتھ ملیں گی نہ کہ سائل محتاج کی طرح بے قدری اور بے وقعتی کے ساتھ) اور جو لوگ بے حکم تھے سو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے وہ لوگ جب اس سے باہر نکلنا چاہیں گے (اور کنارہ کی طرف کو بڑھیں گے گو بوجہ گہرائی کے اور دروازوں کے مقفل ہونے کے نکل نہ سکیں گے، مگر ایسے وقت میں یہ حرکت طبعی ہوتی ہے) تو پھر اسی میں دھکیل دیئے جاوینگے اور ان کو کہا جائے گا کہ دوزخ کا وہ عذاب چکھو جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے، (اور یہ عذاب موعود تو آخرت میں ہوگا) اور ہم ان کو قریب کا (یعنی دنیا میں آنے والا) عذاب بھی اس بڑے عذاب (موعود فی الآخرۃ) سے پہلے چکھا دیں گے (جیسے امراض واسقام ومصائب کذا فی الدر مرفوعاً وموقوفاً، کیونکہ امراض وآفات حسب تصریح قرآن اکثر اعمالِ بد کے سبب آتے ہیں) تاکہ یہ لوگ (متاثر ہوکر کفر سے) باز آئیں (کقولہ تعالیٰ ظَهَرَ الْفَسَادُ (الیٰ) يَرْجِعُوْنَ، پھر جو باز نہ آئے اس کے لئے عذاب اکبر ہے ہی) اور (ایسے لوگوں پر عذاب ہونے سے کچھ تعجب نہ ہونا چاہئے کیونکہ) اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیتیں یاد دلائی جائیں پھر وہ ان سے اعراض کرے (تو اس کے استحقاقِ عذاب میں کیا شبہ ہے، اس لئے) ہم ایسے مجرموں سے بدلہ لیں گے ؛

معارف ومسائل

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ، اس سے پہلی آیت میں منکرین قیامت کو تنبیہ اور ان کے اس استعجاب کا جواب تھا کہ مرنے اور مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ ہوں گے، اس آیت میں اس کا بیان ہے کہ اپنی موت پر دھیان دو اور غور کرو تو وہ خود حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ایک بڑا مظہر ہے، تم اپنی غفلت وجہل سے سمجھتے ہو کہ انسان کی موت خود بخود آجاتی ہے، بات یہ نہیں بلکہ اللہ کے نزدیک تمہاری موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ اور اس کے لئے فرشتوں کا ایک خاص نظام ہے، جن میں بڑے عزرائیل علیہ السلام ہیں کہ ساری دنیا کی موت ان کے انتظام میں دی گئی ہے۔ جس شخص کی جس وقت، جس جگہ موت مقدر ہے ٹھیک اسی وقت وہ اس کی رُوح قبض کرتے ہیں۔ آیتِ مذکورہ میں اسی کا بیان ہے۔ اور اس میں ملک الموت بلفظ مفرد ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد عزرائیل علیہ السلام ہیں۔ اور ایک دوسری آیت میں فرمایا ہے اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اس میں ملائکہ بلفظ جمع لایا گیا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ عزرائیل علیہ السلام تنہا یہ کام انجام نہیں دیتے، ان کے ماتحت بہت سے فرشتے اس میں شریک ہوتے ہیں۔

قبض رُوح اور ملک الموت کے متعلق بعض تفصیلات

امام تفسیر مجاہد نے فرمایا کہ ساری دنیا ملک الموت کے سامنے ایسی ہے جیسے کسی انسان کے سامنے ایک کھلے طشت میں دانے پڑے ہوں، وہ جس کو چاہے اٹھالے۔ یہ مضمون ایک مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے (ذکرہ القرطبی فی التذکرہ)

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایک انصاری صحابی کے سرھانے ملک الموت کو دیکھا تو فرمایا کہ میرے صحابی کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو۔ ملک الموت نے جواب دیا کہ آپ مطمئن رہیں، میں ہر مؤمن کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرتا ہوں اور فرمایا کہ جتنے آدمی شہروں میں یا دیہات اور جنگلوں پہاڑوں میں یا دریا میں آباد ہیں، میں ان میں سے ہر ایک کو دن میں پانچ مرتبہ دیکھتا ہوں۔ اس لئے میں ان کے ہر چھوٹے بڑے سے بلاواسطہ واقف ہوں۔ پھر فرمایا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ جو کچھ ہے اللہ کے حکم سے ہے ورنہ میں اگر ایک مچھر کی رُوح بھی قبض کرنا چاہوں تو مجھے اس پر قدرت نہیں، جب تک اللہ تعالیٰ ہی کا امر اس کے لئے نہ آجائے۔

کیا جانوروں کی رُوح بھی ملک الموت قبض کرتے ہیں؟

مذکورہ روایتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے

کہ مچھر کی روح بھی باذنِ خداوندی ملک الموت ہی قبض کرتے ہیں۔ حضرت امام مالکؒ نے ایک سوال کے جواب میں یہی فرمایا ہے، مگر بعض دوسری روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے کے ذریعہ قبضِ روح انسان کے لئے مخصوص ہے، اس کی شرافت وکرامت کے لئے باقی جانور باذنِ خداوندی بغیر واسطہ فرشتے کے مرجائیں گے (ذکرہ ابن عطیہ از قرطبی)

یہی مضمون ابوالشیخ، عقیلی، دیلمی وغیرہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہائم اور حشرات الارض سب کے سب اللہ کی تسبیح میں مشغول رہتے ہیں (یہی ان کی زندگی ہے) جب اُن کی تسبیح ختم ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی رُوح قبض فرمالیتا ہے، جانوروں کی موت ملک الموت کے سپرد نہیں۔ اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت ابن عمرؓ سے بھی روایت کی گئی ہے۔ (مظہری)

اور ایک روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عزرائیل علیہ السلام کے سپرد ساری دنیا کی موت کا معاملہ کیا تو انھوں نے عرض کیا اے میرے پروردگار! آپ نے مجھے ایسی خدمت سپرد کی کہ ساری دنیا اور سب بنی آدم مجھے برا کہیں گے، اور جب میرا ذکر آئے گا برائی سے کریں گے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اس کا تدارک اس طرح کردیا کہ دنیا میں موت کے کچھ ظاہری اسباب اور امراض رکھ دیتے ہیں جن کے سبب لوگ موت کو ان اسباب وامراض کی طرف منسوب کریں گے آپ ان کی بدگوئی سے محفوظ رہیں گے۔ (قرطبی فی التفسیر والتذکرہ)

اور امام بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جتنے امراض اور درد اور زخم وغیرہ ہیں وہ سب موت کے قاصد ہیں، انسان کو اس کی موت یاد دلاتے ہیں، پھر جب موت کا وقت آجاتا ہے تو ملک الموت مرنے والے کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ اے بندۂ خدا میں نے اپنے آنے سے پہلے کتنی خبریں کتنے قاصد یکے بعد دیگرے تجھے خبردار کرنے اور موت کی تیاری کرنے کے لئے بصورتِ امراض وحوادث بھیجے ہیں، اب میں آپہونچا جس کے بعد کوئی اور خبر دینے والا یا کوئی قاصد نہیں آئے گا اب تم اپنے رب کے حکم کو لامحالہ مانوگے خواہ خوشی سے یا مجبوری سے (مظہری)

مسئلہ:۔ ملک الموت کسی کی موت کا وقت پہلے سے نہیں جانتا جب تک کہ اس کو حکم نہ دیا جائے کہ فلاں کی روح قبض کرلو (اخرجہ احمد وابن ابی الدنیا عن معمر، مظہری)

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا، سابقہ آیات میں کفار ومشرکین ومنکرینِ قیامت کو تنبیہات تھیں۔ اس کے بعد (اِنَّمَا يُؤْمِنُ

بِاٰيٰتِنَا) سے مؤمنین مخلصین کی خاص صفات اور ان کے لئے درجات عظیمہ کا ذکر ہے۔ ان مؤمنین کی ایک صفت آیت مذکورہ میں یہ بتلائی گئی ہے کہ ان کے پہلو اپنے بستروں سے الگ ہوجاتے ہیں، اور بستروں سے اُٹھ کر اللہ کے ذکر اور دعاء میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ اللہ کی ناراضی اور عذاب سے ڈرتے ہیں، اور اس کی رحمت اور ثواب کے امیدوار رہتے ہیں۔ یہی امید وبیم کی ملی جلی حالت ان کو ذکر ودعاء کیلئے مضطرب رکھتی ہے۔

نمازِ تہجد

بستروں سے اُٹھ کر ذکر ودعاء میں مشغول ہوجانے سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک نمازِ تہجد اور نوافل ہیں جو سوکر اُٹھنے کے بعد پڑھی جاتی ہیں (ہو قول الحسن ومجاہد ومالک والاوزاعی) اور روایاتِ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

مسند احمد، ترمذی، نسائی وغیرہ میں حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھا۔ ایک روز میں دورانِ سفر میں صبح کے وقت آپ کے قریب ہوا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلا دیجئے جو مجھے جنت میں داخل کرے، اور جہنم سے دور کردے۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے ایک بڑی چیز کا سوال کیا، مگر جس کے لئے اللہ تعالیٰ آسان کردے اس کو وہ آسان ہوجاتی ہے۔ اور فرمایا کہ وہ عمل یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو، اور بیت اللہ کا حج کرو۔ اور پھر فرمایا کہ لو اب میں تمہیں خیر یعنی نیکی کے ابواب بتلا دیتا ہوں (وہ یہ ہیں کہ) روزہ ڈھال ہے (جو عذاب سے بچاتا ہے) اور صدقہ آدمی کے گناہوں کی آگ بجھا دیتا ہے، اسی طرح آدمی کی نماز درمیان شب میں۔ اور یہ فرماکر قرآن مجید کی آیت مذکورہ تلاوت فرمائی تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ

حضرت ابوالدرداءؓ اور قتادہؒ اور ضحاکؒ نے فرمایا ہے کہ پہلوؤں کے بستروں سے الگ ہوجانے کی یہ صفت اُن لوگوں پر بھی صادق ہے جو عشاء کی نماز جماعت سے ادا کریں پھر صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھیں۔ اور ترمذی میں بسند صحیح حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ یہ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عشاء کی نماز سے پہلے نہ سونے اور جماعتِ عشاء کا انتظار کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔

اور بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت ان لوگوں سے متعلق ہے جو مغرب اور عشاء کے درمیان نوافل پڑھتے ہیں۔ (رواہ محمد بن نصر) اور حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کے متعلق فرمایا کہ جو لوگ جب آنکھ کھلے اللہ کا ذکر کریں لیٹے، بیٹھے اور کروٹ پر، وہ بھی اس میں داخل ہیں۔

ابن کثیر اور دوسرے ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ ان سب اقوال میں کوئی تضاد نہیں، صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت ان سب کو شامل ہے۔ اور آخر شب کی نماز ان سب میں اعلیٰ و افضل ہے، بیان القرآن میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

اور حضرت اسماء بنت یزیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو قیامت کے روز جمع فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک منادی کھڑا ہوگا جس کی آواز تمام مخلوقات سنیں گی وہ ندا دے گا کہ اہل محشر آج جان لیں گے کہ اللہ کے نزدیک کون لوگ عزت و اکرام کے مستحق ہیں۔ پھر وہ فرشتہ ندا دے گا کہ اہل محشر میں سے وہ لوگ کھڑے ہوں جن کی صفت یہ تھی تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یعنی ان کے پہلو بستروں سے الگ ہو جاتے ہیں، اس آواز پر یہ لوگ کھڑے ہوں گے جن کی تعداد قلیل ہوگی (ابن کثیر) اور اسی روایت کے بعض الفاظ میں ہے کہ یہ لوگ بغیر حساب کے جنت میں بھیج دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد اور تمام لوگ کھڑے ہوں گے، ان سے حساب لیا جائے گا (مظہری)

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ، ادنیٰ بمعنی اقرب ہے، اور عذاب ادنیٰ سے مراد دنیا کے مصائب و آفات، اور امراض وغیرہ ہیں، اور عذاب اکبر سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔

دنیا کے مصائب اُن لوگوں کے لئے رحمت ہیں جو اللہ کی طرف رجوع کریں!!!!

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کو ان کے گناہوں پر متنبہ کرنے کے لئے دنیا میں اُن پر امراض اور مصائب و آفات مسلط کر دیتے ہیں، تاکہ یہ متنبہ ہو کر اپنے گناہوں سے باز آجائیں، اور آخرت کے عذاب اکبر سے نجات پائیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ گنہگاروں کے لئے دنیا کے مصائب و آفات اور امراض و تکالیف بھی ایک قسم کی رحمت ہی ہیں کہ غفلت سے باز آکر عذاب آخرت سے بچ جائیں۔ البتہ جو لوگ آفات پر بھی اللہ کی طرف رجوع نہ ہوں ان کے لئے یہ دوہرا عذاب ہو جاتا ہے، ایک اسی دنیا میں نقد اور دوسرا آخرت کا عذاب اکبر۔ اور انبیاء و اولیاء اللہ پر جو آفات و مصائب آتے ہیں ان کا معاملہ ان سب سے الگ ہے، وہ ان کے امتحان اور امتحان کے ذریعہ رفع درجات کے لئے ہوتے ہیں، اور پہچان اس کی یہ ہے کہ ان لوگوں کو امراض و آفات کے وقت بھی ایک قسم کا قلبی سکون و اطمینان اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

بعض جرائم کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے

اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ، بظاہر لفظ مجرمین میں ہر قسم کے مجرم شامل ہیں، اور انتقام بھی عام ہے خواہ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں میں۔ مگر بعض روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تین گناہ ایسے ہیں کہ ان کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ملتی ہے، ایک حق کے خلاف جھنڈوں اور نعروں کے ساتھ اعلانًا کوشش کرنا، دوسرے والدین کی نافرمانی، تیسرے ظالم کی امداد۔ (رواہ ابن جریر عن معاذ بن جبلؓ)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَ

اور ہم نے دی ہے موسیٰ کو کتاب سو تو مت رہ دھوکے میں اس کے ملنے سے اور

جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝۲۳ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً

کیا ہم نے اس کو ہدایت بنی اسرائیل کے واسطے۔ اور کئے ہم نے ان میں پیشوا جو

يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۗ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝۲۴

راہ چلاتے تھے ہمارے حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے اور رہے ہماری باتوں پر یقین کرتے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ

تیرا رب جو ہے وہی فیصلہ کرے گا ان میں دن قیامت کے جس بات میں کہ وہ اختلاف

يَخْتَلِفُوْنَ ۝۲۵ اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ

کرتے تھے۔ کیا ان کو راہ نہ سوجھی اس بات سے کہ کتنی غارت کر ڈالیں ہم نے ان سے

الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۭ اَفَلَا

پہلے جماعتیں کہ پھرتے ہیں یہ اُن کے گھروں میں، اس میں بہت نشانیاں ہیں، کیا وہ

يَسْمَعُوْنَ ۝۲۶ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ

سنتے نہیں؟ کیا دیکھا نہیں انھوں نے کہ ہم ہانک دیتے ہیں پانی کو ایک زمین چٹیل کی طرف

فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ۭ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ۝۲۷

پھر ہم نکالتے ہیں اس سے کھیتی کہ کھاتے ہیں اس میں سے ان کے چوپائے اور خود وہ بھی، پھر کیا دیکھتے نہیں؟

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْفَتْحُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٨﴾ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ

اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ فیصلہ اگر تم سچے ہو ۔ تو کہہ کہ فیصلہ کے دن

لَا يَنفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِيمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٢٩﴾ فَأَعْرِضْ

کام نہ آئیگا منکروں کو ان کا ایمان لانا اور نہ ان کو ڈھیل ملے گی ۔ سو تو خیال چھوڑ

عَنْهُمْ وَانتَظِرْ إِنَّهُم مُّنتَظِرُونَ ﴿٣٠﴾ ۳ ع ۱۶

ان کا اور منتظر رہ وہ بھی منتظر ہیں ۔

خلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (آپ ہی کی طرح) کتاب دی تھی (جس کی اشاعت میں ان کو تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں، اسی طرح آپ کو بھی برداشت کرنا چاہئے، ایک تسلی تو یہ ہوئی، پھر اسی طرح آپ کو بھی کتاب دی) سو آپ (اپنی) اس (کتاب) کے ملنے میں کچھ شک نہ کیجئے (کقولہ تعالیٰ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ، مطلب یہ کہ آپ صاحب کتاب صاحب خطاب ہیں پس جب آپ اللہ کے نزدیک ایسے مقبول ہیں تو اگر مٹھے چند احمق آپ کو قبول نہ کریں تو کوئی غم کی بات نہیں، ایک تسلی کی بات یہ ہوئی) اور ہم نے اس (کتاب موسیٰ) کو بنی اسرائیل کے لئے موجب ہدایت بنایا تھا (اسی طرح آپ کی کتاب سے بہتوں کو ہدایت ہوگی، آپ خوش رہئے، ایک تسلی یہ ہوئی) اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں بہت سے (دین کے) پیشوا بنا دیئے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے، جبکہ وہ لوگ (تکلیف پر) صبر کئے رہے، اور ہماری آیتوں کا یقین رکھتے تھے (اس لئے ان کی اشاعت اور خلق کی ہدایت میں مشقت گوارا کرتے تھے، یہ تسلی ہے مومنین کو کہ تم لوگ صبر کرو، اور جب تم صاحب یقین ہو اور یقین کا مقتضا صبر کرنا ہے تو تم کو صبر ضروری ہے، اس وقت ہم تم کو بھی ائمہ دین بنا دیں گے یہ تو تسلی دنیا کے اعتبار سے ہے، اور ایک تسلی آخرت کے اعتبار سے تم کو رکھنا چاہئے اور وہ امر موجب تسلی یہ ہے کہ) آپ کا رب قیامت کے روز ان سب کے آپس میں (عملی) فیصلہ ان امور میں کردے گا جن میں یہ باہم اختلاف کرتے تھے (یعنی مومن کو جنت میں اور کفار کو دوزخ میں ڈال دیگا اور قیامت بھی کچھ دور نہیں، اس سے بھی تسلی حاصل کرنا چاہئے، اور اس مضمون کو سن کر کفار دو شبہے کر سکتے تھے، ایک یہ کہ ہم اسی کو نہیں مانتے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا

کفر ناپسند ہے جیسا یُغْضِبُ سے مفہوم ہوتا ہے، دوسرا یہ کہ ہم قیامت ہی کو ناممکن سمجھتے ہیں، آگے دونوں کے دفع کے لئے دو مضمون ہیں، اول یہ کہ ان کو جو کفر کے مبغوض ہونے میں شبہ ہے تو) کیا ان کو یہ امر موجب رہنمائی نہیں ہوا کہ ہم ان سے پہلے (ان کے کفر و شرک ہی کے سبب) کتنی امتیں ہلاک کر چکے ہیں (کہ ان کے طریق ہلاکت سے و نیز نبی کی پیشگوئی کے بعد بطور خرق عادت کے واقع ہونے سے خدا کا غضب ٹپکتا تھا جس سے مبغوض ہونا کفر کا صاف واضح ہوتا ہے) جن کے رہنے کے مقامات میں یہ لوگ (اثنائے سفر شام میں) آتے جاتے (گذرتے) ہیں اس (امر) میں (تو) صاف نشانیاں (مبغوضیت کفر کی موجود) ہیں کیا یہ لوگ (ان گذشتہ امم کے قصص) سنتے نہیں ہیں (کہ مشہور ہیں اور زبانوں پر مذکور ہیں دوسرا مضمون یہ کہ ان کو جو قیامت میں شبہ عدم امکان کا ہے تو) کیا انہوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ ہم (بادلوں یا نہروں وغیرہ کے ذریعہ سے) خشک زمین کی طرف پانی پہونچاتے ہیں پھر اس کے ذریعہ سے کھیتی پیدا کرتے ہیں جس سے ان کے مواشی اور وہ خود بھی کھاتے ہیں تو کیا (اس بات کو شب و روز) دیکھتے نہیں ہیں (یہ صاف نمونہ ہے مر کر زندہ ہونے کا، جیسا کئی جگہ اس کی تقریر گذری ہے، پس دونوں شبہے دفع ہوگئے) اور یہ لوگ (قیامت اور فیصلہ کا ذکر سن کر بطور استعجال و استہزاء کے یوں) کہتے ہیں کہ اگر تم (اس بات میں) سچے ہو تو (بتلاؤ) یہ فیصلہ کب ہوگا، آپ فرما دیجئے کہ (تم عبث اس کا تقاضا کرتے ہو تمہارے لئے تو وہ بڑی مصیبت کا دن ہے، کیونکہ) اس فیصلہ کے دن کافروں کو ان کا ایمان لانا (بالکل) نفع نہ دیگا (اور یہی ایک صورت ان کے بچاؤ کی تھی اور وہی مفقود ہے) اور (نفع نجات تو کیا ہوتا) ان کو مہلت بھی (تو) نہ ملے گی سو (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی باتوں کا خیال نہ کیجئے (جن کے خیال سے غم ہوتا ہے) اور آپ (فیصلہ موعود کے) منتظر رہئے یہ بھی (اپنے زعم میں آپ کے ضرر کے) منتظر ہیں (کقولہم نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ، مگر معلوم ہو جائے گا کس کا انتظار مطابق واقع کے ہے اور کس کا نہیں، کقولہ تعالیٰ فی جوابہم قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ) ؎

معارف و مسائل

فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗىِٕهٖ، لقاء کے معنی ملاقات کے ہیں اس آیت میں کس کی ملاقات کس سے مراد ہے؟ اس میں اہل تفسیر کے اقوال مختلف ہیں۔ ان میں ایک وہ ہے جس کو خلاصہ تفسیر میں اختیار کیا گیا ہے، کہ لِقَاۗىِٕهٖ کی ضمیر کتاب یعنی قرآن کی طرف راجع

قرار دینے کا مطلب یہ لیا گیا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے کتاب دی آپ بھی اپنی کتاب کے آنے میں کوئی شک نہ کریں، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں قرآن کے متعلق ایسے الفاظ آئے ہیں وَاِنَّکَ لَتُلَقَّی الْقُرْاٰنَ

اور حضرت ابن عباسؓ اور قتادہؒ سے اس کی تفسیر اس طرح منقول ہے کہ لِقَآئِہٖ کی ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے، اور اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ آپ اس میں شک نہ کریں کہ آپ کی ملاقات موسیٰ علیہ السلام سے ہوگی۔ چنانچہ ایک ملاقات شب معراج میں ہونا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، پھر قیامت میں ملاقات ہونا بھی ثابت ہے۔

اور حضرت حسن بصریؒ نے اس کی یہ تفسیر فرمائی ہے کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو ایک کتاب دی گئی اور لوگوں نے ان کی تکذیب کی اور ان کو ستایا۔ آپ بھی یقین رکھیں کہ یہ سب چیزیں آپ کو بھی پیش آئیں گی۔ اس لئے آپ کفار کی ایذاؤں سے دلگیر نہ ہوں، بلکہ اس کو سنتِ انبیاء سمجھ کر برداشت کریں۔

کسی قوم کا مقتدا، وامام بننے کے لئے دو شرطیں

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ، "یعنی ہم نے بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگوں کو امام اور پیشوا و مقتدا بنا دیا جو اپنے پیغمبر کے نائب ہونے کی حیثیت سے باذنِ ربانی لوگوں کو ہدایت کیا کرتے تھے، جبکہ انھوں نے صبر کیا، اور جبکہ وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں"

اس آیت میں علماء بنی اسرائیل میں سے بعض کو امامت و پیشوائی کا درجہ عطا فرمانے کے دو سبب ذکر فرمائے ہیں اوّل صبر کرنا، دوسرے آیاتِ الٰہیہ پر یقین کرنا۔ صبر کرنے کا مفہوم عربی زبان کے اعتبار سے بہت وسیع اور عام ہے۔ اس کے لفظی معنی باندھنے اور ثابت رہنے کے ہیں۔ اس جگہ صبر سے مراد احکامِ الٰہیہ کی پابندی پر ثابت قدم رہنا اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام یا مکروہ قرار دیا ہے ان سے اپنے نفس کو روکنا ہے۔ جس میں تمام احکامِ شریعت کی پابندی آجاتی ہے، اور یہ بہت بڑا عملی کمال ہے۔ دوسرا سبب ان کا آیاتِ الٰہیہ پر یقین رکھنا ہے۔ اس میں آیات کے مفہوم کو سمجھنا پھر سمجھ کر اس پر یقین کرنا دونوں داخل ہیں، یہ بہت بڑا کمال علمی ہے۔

خلاصہ یہ ہو کہ امامت و پیشوائی کے لائق اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہ لوگ ہیں جو عمل میں بھی کامل ہوں اور علم میں بھی، اور یہاں عملی کمال کو علمی کمال سے مقدم بیان فرمایا ہے

کہ ترتیب طبعی میں علم عمل سے مقدم ہوتا ہے، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ کے نزدیک وہ علم قابلِ اعتبار ہی نہیں جس کے ساتھ عمل نہ ہو۔

ابن کثیرؒ نے بعض علماء کا قول اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ بِالصَّبْرِ وَالْیَقِیْنِ تُنَالُ الْاِمَامَةُ فِی الدِّیْنِ، "یعنی صبر اور یقین ہی کے ذریعہ دین میں کسی کو امامت کا درجہ مل سکتا ہے"

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا، "یعنی کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم خشک زمین کی طرف پانی کو (بعض مواقع میں) زمین پر چلا کر لے جاتے ہیں، جس سے اُن کی کھیتیاں اُگتی ہیں" جُرُز خشک زمین کو کہتے ہیں جس میں درخت نہیں اُگتے۔

زمین کی آبپاشی کا ایک خاص حکیمانہ نظام

خشک زمین کو سیراب کرنے اور اس میں نباتات اُگانے کا ذکر قرآن کریم میں جابجا اس طرح آیا ہے کہ اس زمین پر بارش برستی ہے، اس سے زمین تر و تازہ ہو کر اُگانے کے قابل ہو جاتی ہے۔ مگر اس آیت میں بارش کے بجائے پانی کو زمین پر چلا کر خشک زمین کی طرف لے جانے اور اس سے درخت اُگانے کا ذکر فرمایا ہے۔ یعنی بارش کسی دوسری زمین پر نازل کی جاتی ہے وہاں سے ندی نالوں کے ذریعہ زمین پر چلا کر پانی کو خشک زمین کی طرف لیجایا جاتا ہے جہاں بارش نہیں ہوتی۔

اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ بعض زمینیں ایسی خام اور نرم ہوتی ہیں جو بارش کی متحمل نہیں ہوتیں، اگر وہاں پوری بارش برسائی جائے تو عمارتیں منہدم ہو جائیں، درخت اُکھڑ جائیں۔ اس لئے قدرت نے ایسی زمینوں کے لئے یہ نظام بنایا ہے کہ بارش تو اس زمین پر نازل کی جاتی ہے جو اس کی متحمل ہے، پھر یہاں سے پانی بہا کر ایسی زمینوں کی طرف لے جایا جاتا ہے جو بارش کی متحمل نہیں، جیسے مصر کی زمین ہے۔ اور بعض مفسرین نے یمن اور شام کی بعض زمینوں کو اس کا مصداق قرار دیا ہے (کما روی عن ابن عباسؓ والحسن)

اور صحیح یہ ہے کہ یہ مضمون ایسی تمام زمینوں کو شامل ہے، اور مصر کی زمین خصوصیت سے اس میں شامل ہے، جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ مگر بلادِ حبشہ افریقہ کی بارشوں کا پانی دریائے نیل کے ذریعہ مصر میں آتا ہے، اور وہاں کی سُرخ مٹی ساتھ لاتا ہے، جس میں انبات کا مادّہ زیادہ ہے۔ اس لئے مصر کے لوگ اپنے ملک میں بارش نہ ہونے کے باوجود ہر سال نئے پانی اور نئی مٹی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ "یعنی کفار یہ کہتے ہیں کہ وہ فتح کب ہوگی، جس کا آپ ذکر کرتے ہیں کہ مؤمنین کو کفار پر غلبہ ہوگا، ہمیں تو کہیں اس کے آثار نظر نہیں آتے،

ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان خائف ہیں، چھپتے پھرتے ہیں۔

اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ، "یعنی آپ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ تم ہماری فتح کا دن ہم سے کیا پوچھتے ہو وہ دن تو تمہاری مصیبت کا ہوگا۔ کیونکہ جس وقت ہماری فتح ہوگی تو اس وقت تم عذاب میں گرفتار ہو چکے ہوگے، خواہ دنیا میں جیسے غزوۂ بدر میں ہوا یا آخرت میں۔ اور جب اللہ کا عذاب کسی کو پکڑ لیتا ہے پھر اس کا ایمان قبول نہیں ہوتا۔ کذا ذکرہ ابن کثیر

اور بعض حضرات نے اس جگہ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ کے معنی روز قیامت کے کئے ہیں۔ اوپر خلاصۂ تفسیر میں اسی کو اختیار کیا گیا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم ؏

تمت

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ بِحَمْدِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ
فِيْ لَيْلَةِ عَرَفَةَ مِنْ ذِي الْحِجَّةِ سَنَةَ ١٣٩١هـ

سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ

	سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثٌ وَّسَبْعُوْنَ اٰيَةً وَّتِسْعُ رُكُوْعَاتٍ	
	سورۂ احزاب مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی تہتر آیتیں ہیں اور نو رکوع	
	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○	
	شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔	

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

اے نبی ڈر اللہ سے اور کہا نہ مان منکروں کا اور دغابازوں کا مقرر اللہ ہے

كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ① وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّ

سب کچھ جاننے والا حکمتوں والا۔ اور چل اسی پر جو حکم آئے تجھ کو تیرے رب کی طرف سے، بیشک

اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ② وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى

اللہ تمہارے کام کی خبر رکھتا ہے۔ اور بھروسہ رکھ اللہ پر اور اللہ

	بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ③	
	کافی ہے کام بنانے والا	

خلاصۂ تفسیر

اے نبی اللہ سے ڈرتے رہئے (اور کسی سے نہ ڈریئے اور ان کی دھمکیوں کی ذرا پروا نہ کیجئے) اور کافروں کا (جو کھلم کھلا دین کے خلاف مشورے دیتے ہیں) اور منافقوں کا (جو درپردہ ان کے ساتھ متفق ہیں) کہنا نہ مانئے (بلکہ اللہ ہی کا کہنا کیجئے) بیشک اللہ تعالیٰ بڑا علم والا